[1]ڈاکٹر سائرہ ارشاد
استاد، شعبہ اردو، گورنمنٹ صادق ویمن یونی ورسٹی بہاول پور

خطۂ بہاول پور کے نمائندہ انشائیہ نگار

Abstract:

Insightfulness is a popular genre shifting from English to Urdu literature. In nonfiction, it is a genre that shows the brightest thing about possibilities. This is why the insurer looks at the same thing from different angles because of the depth of thoughts and the observations. In the insights, life matters are presented with new angles. Insider creates insights by talking to them instead of finalizing personal experiences. There is no definitive conclusion to any kind of consultation rather, the conversation ends at a beautiful point with brief summary. Sir Syed Ahmad khan along with his writing colleagues introduced modern Urdu prose in a new way and this was what led to the promotion of insanity. In this regard Dr. Wazeer Agha index book Khayal pary , takes precedence. Asmat ullah, Faheem Azmi, Akber Hammedi ,. Saleem Akhter, Anjum Niazi , Nasir Abas Nayer , Mushtaq Qamar and Jameel Azar played a significant role in advancing this series of insights. Thus in the Urdu literature , where Inshaya Nigari has briefly proclaimed itself , in the region of Bahawalpur, it was written about this genre and the beautiful nightmares came into view.

Key words: Essay, imagination, Arguments and proofs, the creative process, literature, low charisma, plaintiff.

تلخیص:

انشائیہ نگاری انگریزی سے اردو ادب کی جانب منتقل ہونے والی ایک مقبول صنف ہے۔ غیر افسانوی ادب میں یہ ایک ایسی صنف قرار پائی ہے جس میں امکانات کے حوالے سے کئی روشن پہلو نمو دار ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انشائیہ نگار فکری گہرائی اور مشاہدات کی بدولت ایک ہی چیز کو مختلف زاویوں سے دیکھتا ہے۔ انشائیے میں زندگی کے معاملات کو نئے زاویوں سے پیش کیا جاتا ہے۔ انشائیہ نگار ذاتی تجربات کو حتمی صورت دینے کی بجائے بات سے بات نکالتے ہوئے انشائیہ تخلیق کرتا ہے۔ اس میں کسی قسم کی مشاورت یا حتمی نتائج اخذ نہیں کیے جاسکتے بلکہ شگفتہ انداز میں اختصار کے ساتھ ایک خوب صورت موڑ پر بات ختم کی جاتی ہے۔ سر سیّد احمد خاں نے اپنے اہلِ قلم ساتھیوں کے ساتھ مل کر جدید اُردو نثر کو نئے انداز سے متعارف کرایا اور یہی چیز انشائیہ نگاری کے فروغ کا باعث بنی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر وزیر آغا کی انشائیوں پر مبنی کتاب ''خیال پارے'' اوّلیت کا درجہ رکھتی ہے۔ انشائیہ نگاری کے اس سلسلے کو آگے بڑھانے میں عصمت اللہ، ڈاکٹر فہیم عظمی، اکبر حمیدی، ڈاکٹر سلیم اختر، انجم نیازی، ناصر عباس نیر، مشتاق قمر اور

[1] استاد، شعبہ اردو، گورنمنٹ صادق ویمن یونی ورسٹی بہاول پور

جمیل آذر نے نمایاں کردار ادا کیا۔ یوں اردو ادب میں انشائیہ نگاری نے جہاں مختصر عرصے میں خود کو منوایا ہے وہیں خطۂ بہاول پور میں بھی اس صنف کے حوالے سے طبع آزمائی کی گئی اور کئی خوب صورت انشائیے منظر عام پر آئے۔

کلیدی الفاظ: انشا، دلائل وبراہین، خیال پارے، تخلیقی عمل، ادب لطیف، جواہر پارے، ادنی کرشمہ، مدعائے دل

انشائیہ کے ابتدائی نقوش قبل مسیح کے مختلف ادیبوں اور مفکرین کے ہاں ملتے ہیں۔ اس حوالے سے کنفیوشس، افلاطون اور ارسطو کے علاوہ ان کے دیگر ہم عصروں نے تخلیقی طور پر اس صنف کا آغاز تو کیا لیکن ان کی تحریریں باقاعدہ طور پر انشائیوں میں نہ ڈھل سکیں۔ ۱۵۷۰ء میں مونتین نے پہلی بار "Essi "یا "Essay" کا لفظ ستعمال کیا جس میں اظہار ذات کا ہلکے پھلکے انداز میں تذکرہ شامل تھا۔ مونتین کا اسلوب تازگی و شگفتگی پر مبنی تھا اس لیے اس کے انشائیے مقبول عام ہوئے۔ انگریزی ادب میں بیکن اور کاؤلے نے اس صنف کو فروغ دیا۔ جدید دور میں انشائیہ نگاروں نے خود کو مضمون نگاروں کی صف سے الگ رکھنے کے لیے "Personal Essay"، یا" Light Essay" یعنی انشائیہ کی پہچان دی، یوں اس صنف کی اصطلاح بے پناہ وسعت کی حامل قرار دی جاسکتی ہے۔

انشائیہ نگاری کی صنف انگریزی زبان سے اُردو ادب میں آئی۔ انگریزی میں اسے "Light Essay" کہا جاتا ہے۔ اُردو میں یہ لفظ "انشا" سے نکلا ہے جسے آغاز میں "رَف ڈرافٹ" بھی کہا جاتا تھا۔

> "جب انگریزی Essay یا فرانسیسی Essai کی طرز پر اُردو میں تخیلاتی تحریریں وجود میں آنے لگیں تو انھیں تخیل آفرینی اور عبارت آرائی کی بناء پر "انشائیہ" کا نام دیا گیا۔"[۱]

اُردو ادب میں انشائیے کی کوئی حتمی تعریف مقرر نہیں کی جاسکتی تاہم اس کی خصوصیات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی بھی موضوع پر غیر رسمی اور ہلکے پھلکے انداز میں اظہار کرنا انشائیہ کہلاتا ہے۔

> "انشائی ادب کو کئی ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ انشائیہ، انشا پردازی، انشائے لطیف، خیالات پریشاں، ادب لطیف، جواہر پارے، مضمون، جواب مضمون، ایسے Essay، لائٹ ایسے، پرسنل ایسے وغیرہ۔"[۲]

انشائیہ نگاری میں شگفتگی اور تروتازگی کا عنصر جابجا ملتا ہے جس کی وجہ سے قاری سرشاری محسوس کرتا ہے۔ انشائیے میں غیر رسمی اور جدید ترین صورتِ حال کو مد نظر رکھا جاتا ہے جس سے سوچ کے نئے دَر وا ہوتے ہیں۔ انشائیے میں گردوپیش پھیلے ہوئے معاملات ایک نئے رنگ اور دل کشی پر مشتمل دکھائی دیتے ہیں۔

''معمولی کو غیر معمولی کر دینا اور غیر معمولی کو معمولی بنا دینا، انشائیہ نگار کی نیرنگی
نظر کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔''[۳]

انشائیہ نگاری دراصل مضمون کی ہی شکل قرار دی جاسکتی ہے تاہم اس کا انداز غیر رسمی گفتگو اور بے تکلفی پر مبنی ہوتا ہے۔ اس میں انشائیہ نگار داخلی جذبات واحساسات کو مد نظر رکھتے ہوئے انوکھا انداز اختیار کرتا ہے جو سنجیدگی کی بجائے قاری کو زیر لب مسکرانے پر مجبور کر دیتا ہے۔

''انشائیہ نگار کو خاص طور پر سنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اسے اپنا مدعائے دل
ظاہر کرنے کے لیے بے تکلف ہونا چاہیے۔''[۴]

انشایئے میں زندگی کے معاملات کو نئے زاویوں سے پیش کیا جاتا ہے جس میں قاری عام ڈگر سے ہٹ کر نئے پہلوؤں سے روشناس ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار ذاتی تجربات کو حتمی صورت دینے کی بجائے بات سے بات نکالتے ہوئے انشائیہ تخلیق کرتا ہے۔ اس میں کسی قسم کی مشاورت یا حتمی نتائج اخذ نہیں کیے جاسکتے بلکہ شگفتہ انداز میں اختصار کے ساتھ ایک خوب صورت موڑ پر بات ختم کی جاتی ہے جس سے قاری کے ذہن و فکر پر تازگی کی کیفیت بر قرار رہتی ہے۔ وہ اُداسی اور غمگینی کی بجائے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگتا ہے۔

''انشائیہ اکڑی ہوئی گردنوں اور انانیت میں مبتلا لوگوں کو جھنجھوڑنے اور انھیں
بیدار کرنے کا نام ہے۔''[۵]

انشائیہ اسلوب کا حصہ قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ یہ الگ صنف ہے جس میں داخلی کیفیت کو اظہار کے پیرائے میں ڈھالا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ جداگانہ مزاج کا حامل ہے۔ انشایئے میں سادہ اور عام فہم لب ولہجے کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔

''اس کے بیانیے میں ایسی نامیاتی قوت پیدا ہو گئی ہے جو خط آفرینی و معنی آفرینی کے مسلسل
عمل سے نہ تھکتی ہے نہ تھکاتی ہے۔''[۶]

انشائیہ نگاری غیر جانب داری سے شخصی رویوں کو منفرد طرز سے اُجاگر کرتی ہے جس کی وجہ سے اُردو ادب کی دیگر نثری اصناف کے مقابلے میں یہ صنف جداگانہ حیثیت کی حامل ہے۔

''انشایئے کے اسلوب میں شگفتگی پیدا ہوتی ہے جو مزاح تو نہیں لیکن اعصاب میں
گدگدی ضرور ہو جاتی ہے۔''[۷]

انشائیہ سنجیدہ مضمون کو بھی مزاح کے پیرائے میں لے آتا ہے۔ اسی وجہ سے اس میں مضمون نگاری جیسی خصوصیات کو تلاش نہیں کیا جاسکتا۔ موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے انشائیہ خاص وضع قطع کا حامل ہے۔

"انشائیہ نگار کا اسلوبِ بیان تو منطقی ہوتا ہے لیکن وہ اپنی گفتگو کرنے کے انداز
کو غیر رسمی بناتا ہے۔"[۸]

اس لطافت کو بعض ناقدین "ذہنی ترنگ" قرار دیتے ہیں جب کہ کئی موقعوں پر اسے "ادب کی پھلجھڑی" بھی کہا گیا ہے۔

"مغرب کے مقابلے میں مشرق کے انشائیہ نگاروں کا ظہور اخبارات کی بجائے ادبی رسائل
کا مرہونِ منت ہے۔"[۹]

اردو ادب میں "Essay" کو بحیثیت مضمون ہی پہچان ملی بعض محققین نے ملا وجہی اور بعض نے سر سید احمد خاں کو اس صنف کا بانی قرار دیا اگرچہ اُردو کا پہلا مضمون نگار سر سیّد احمد خاں کو قرار دیا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے اہلِ قلم ساتھیوں کے ساتھ مل کر جدید اُردو نثر کو نئے انداز سے متعارف کرایا اور یہی چیز انشائیہ نگاری کے فروغ کا باعث بنی۔ اس عہد میں نیاز فتح پوری، میر ناصر علی اور سجاد انصاری کے ہاں انشائی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ماسٹر رام چندر اور مرزا غالب، مولوی ذکاء اللہ، مہدی افادی، سجاد انصاری، خلیق دہلوی، خواجہ حسن نظامی اور سر شیخ عبد القادر کی نثری تحریروں میں انشائی رنگ نمایاں ہے جب کہ انشائیہ نگاری کے واضح خدوخال نہیں ملتے۔ اُردو انشائیے کے ابتدائی دور میں محمد حسین آزاد، خواجہ حسن نظامی، عبد الحلیم شرر، مرزا فرحت اللہ بیگ اور ملا موزی کی تحریروں کو کسی حد تک انشائیہ نما قرار دیا جاسکتا ہے۔۔ بیسویں صدی میں انشائیہ نگاری کے اثرات جن ادیبوں کے ہاں نظر آتے ہیں ان میں سجاد حیدر یلدرم، میاں عبد العزیز، فلک پیما اور قاضی عبد الغفار کے نام اہم ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد ممتاز مفتی، داؤد رہبر، جاوید صدیقی، نصیر آغا، امجد حسین، حسنین کاظمی، غلام علی چودھری اور ممتاز مفتی کے ہاں انشائی طرز کے حامل مضامین ملتے ہیں۔ انشائیہ نگاری کا موجودہ تصور تقسیم ہند کے بعد واضح طور پر اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ ۱۹۶۰ء میں ڈاکٹر وزیر آغا کی انشائیوں پر مبنی کتاب "خیال پارے" اس سلسلے میں اوّلیت کا درجہ رکھتی ہے۔ اسی دور میں عصمت اللہ اور ڈاکٹر فہیم عظمی نے اس تحریک کو آگے بڑھایا جب کہ انشائیے کے خلاف رد عمل بھی پیدا ہوا۔ انشائیہ نگاری کے اس سلسلے کو آگے بڑھانے میں اکبر حمیدی، ڈاکٹر سلیم اختر، انجم نیازی، ناصر عباس نیر، مشتاق قمر اور جمیل آذر نے نمایاں کردار ادا کیا۔

حکیم سیّد میر ظفر زیدی کے نثری مجموعے "نوکِ سناں سے چٹکتی کلیاں" میں شامل پہلا انشائیہ "گریباں اپنا" ایک ایسے شخص کی ناگہانی مرگ پر مشتمل ہے جو کسی حادثہ، بیماری یا شہادت کی بجائے بجلی کے بل کو دیکھ کر زندگی ہار بیٹھتا ہے۔ مرنے کے بعد ان کی ملاقات مختلف شعرائے کرام سے ہوتی ہے۔ ان سب کی عادات و اطوار اور رہن سہن کے بارے میں تفصیل درج کی گئی ہے جب کہ مزاح میں شگفتگی کا عنصر نمایاں ہے۔"

لوہے کے سکے" میں پاکستانی قوم پر طنز کیا گیا ہے کہ وہ کھوٹے اور کھرے کی پہچان سے عاری ہے لہٰذا ہر بار ان کا انتخاب ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔ اس حوالے سے مشہور و معروف سیاسی نعروں سے دل کش منظر کشی کی گئی ہے تاہم اقتدار میں آنے کے بعد کھوکھلی باتیں اپنا وجود ختم کر دیتی ہیں۔ حکیم سیّد میر ظفر زیدی کا انشائیہ "میں بڑا افسر کیوں نہ بن سکا" میں ایک نوجوان کی تعلیمی سرگرمیوں سے دوری کی وجوہات اور والدین کی عدم توجہ کو اس مسئلے کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ انشائیہ "بجٹ نامہ" میں حکومت کی جانب سے پیش کیے جانے والے بجٹ اور مختلف طبقات پر اس کے گہرے اثرات کے بارے میں آگاہ کرتے ہیں۔

"انشائیہ ایسی صنفِ ادب ہے جس میں ردّ و قبول کے میلانات کو دلائل و براہین سے کروٹ دینے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔"[۱۰]

"حسن طلب" میں کائنات کے مالک کی جانب سے دیے گئے تحائف میں مخلوق کی خواہشات کو شامل کرتے ہیں۔ ہر شخص اپنے ذہن کے مطابق خواہشات کی تکمیل چاہتا ہے۔ مختلف درجہ بندیوں کے ذریعے لوگوں کی اقسام سے متعارف کرایا گیا ہے۔ دولت، حکومت، شہرت، عزت اور عورت میں سے ہر کسی کی اپنی مرضی و منشا شامل ہوتی ہے۔ حکیم صاحب ایک فقیر کی درخواست کا احوال بیان کرتے ہیں۔ وہ فرشتوں کے ذریعے درخواست بھجواتا ہے جو نہایت خندہ پیشانی سے منظور کر لی جاتی ہے۔ اس موقع پر فرشتے عرض کرتے ہیں:

"اے رَبِّ جلیل! آخر اس میں ایسا کیا لکھا ہے کہ تجھ جیسی سنجیدہ ہستی کو بھی متبسم ہونا پڑا۔
خدائے ذوالجلال نے فرمایا! یہ نہ لمبی درخواست ہے، نہ کوئی مطالبات کی طویل فہرست۔
خستہ حال فقیر ایک ہی چیز کا طلب گار ہے کہ یارَبّ:

تجھ سے تجھ کو مانگ رہا ہوں

دیکھ مرا یہ حسنِ طلب"[۱۱]

انشائیے میں مختلف طبقوں کی خواہشات کے برعکس فقیر کی حکمت و دانائی کو سراہا گیا ہے کیوں کہ اس نے مال و دولت کی بجائے ایسی ذات کا انتخاب کیا جو تمام آرزوؤں کو پورا کرنے والی ہے جب کہ اس حوالے سے باقی لوگ ناعاقبت اندیش رہے۔ انشائیہ "تقدیر کا چھکا" میں اُردو زبان کی ناقدری، سرکاری قرار دیے جانے کے باوجود اس کی بے وقعتی پر افسوس کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے مختلف کوششوں کو ناکافی قرار دیتے ہوئے حکام کی بے حسی پر تبصرہ بھی شامل ہے۔ یہی کیفیت "جمہوریت نامہ"، "خدا سن لے میری دُعا"، "خوابوں کا جزیرہ" اور "منکہ ایک ادیب ہوں" میں بھی ملتی ہے۔

روشن آرا راؤ کے نثری مجموعے "نگارشاتِ روشن" میں شامل انشائیہ "چاند" آسمان کی خوب صورتی اور زمین پر اس کی پڑنے والی کرنوں سے متعلق ہے تاہم وہ اس منظر کو محض عارضی قرار دیتے ہوئے اپنی حقیقی زندگی میں واپس لوٹ آتی ہیں۔ چاند بظاہر خوب صورت دکھائی دیتا ہے۔

اس کے دھبے کسی کو نظر نہیں آتے جب کہ حقیقی زندگی میں کئی چاند اپنے دھبوں کو سینوں میں سجائے رنج و غم کی کیفیت میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ روشن آرا راؤ چاند کی دل کشی کا موازنہ اپنی ذات سے کرتی ہیں اور انھیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنے درد و غم سینے میں چھپائے بظاہر روشن دکھائی دیتی ہیں تاہم ان کے اندر مہیب سائے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔

"سورج کی روشنی کا عکس جو تم پر پڑتا ہے غائب ہو جائے اور تمھارا یہ خوب صورت چہرہ کسی سیاہ فام حبشی بڑھیا کی مانند ہو جائے۔"[۱۲]

محمد سلیم ملک کا انشائیوں پر مبنی مجموعہ "باتیں ہماری یاد رہیں" کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں مختلف معاشرتی موضوعات کو انشائیہ نگاری کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔ روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے واقعات جب ایک ادیب کی نظر سے گزرتے ہیں تو وہ انھیں اپنے منفرد انداز کی بدولت نہ صرف دیکھتا اور محسوس کرتا ہے بلکہ تحریری صورت میں سامنے لے کے آتا ہے۔

"انشائیہ نگاری کی اپنی انفرادی سوچ، اسلوبِ بیان اور اخلاقی جذبہ ہوتا ہے"[۱۳]

انشائیہ "سپیڈ بریکر" میں راستے کی رکاوٹوں کو موضوع بنایا گیا ہے جو بظاہر رفتار میں کمی کا باعث بنتی ہیں تاہم ان کی وجہ سے گاڑیوں کو دھچکا لگتا ہے۔ سپیڈ بریکر کی مختلف شکلوں کے بارے میں معلومات کے علاوہ شادی کے بریکر سے بھی آگاہ کیا گیا ہے۔

"شادی وہ کتاب ہے جس کا پہلا باب شاعری میں ہوتا ہے اور باقی نثر میں اِدھر یہ نوجوان، شاعری کو گنگنانے لگتے ہیں کہ ان کے گانے بجانے میں کھنڈت پڑ جاتی ہے اور ہر سال چھوٹے چھوٹے بریکر پیدا ہونے لگتے ہیں۔"[۱۴]

انشائیہ انکشاف عرفان اور خط کے اجزاء سے مرکب ہوتا ہے اور یہی خصوصیات محمد سلیم ملک کے انشائیوں میں لطف و آگہی کا باعث ہیں۔

"انشائیہ آج کا سب سے موثر ذریعہ اظہار ہے۔ ڈاکٹر محمد سلیم ملک نے اپنے انشائیوں میں اس موثر ذریعہ اظہار کو عمدگی سے بیان کیا ہے۔"[۱۵]

انشائیہ "سگریٹ نوشی" میں ان افراد کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے جو موقع محل دیکھے بنا اس کام میں مصروف رہتے ہیں۔ دعوتوں میں دھینگا مشتی کو دیکھتے ہوئے سگریٹ کی اس لیے تائید کی جا سکتی ہے کہ لیلیٰ کی انگلی اور مجنوں کی پسلی جیسی جسامت رکھنے والی سگریٹ، صرف سگریٹ نوشی تک محدود رہتی ہے البتہ سگریٹ کی پیٹھ پیچھے برائی ایک معمول کی بات بن چکی ہے۔ ان کا اندازِ بیان دل کشی پر مبنی ہے۔ آسان فہم اور سادہ الفاظ سے انشائیہ اپنی

بھرپور توجہ برقرار رکھتا ہے نیز انشائیہ نگار اپنے عمیق تجربات ومشاہدات کو مد نظر رکھتا ہے۔اسی لیے کہا جاتا ہے کہ انشائیے کا موضوع ذاتی تجربات کا اظہار ہوتا ہے۔

اس انشائیے میں منفرد انداز سے سگریٹ نوشی کا احوال بیان کیا گیا ہے۔بظاہر سگریٹ نوشی کی تائید کرتے ہیں تاہم معانی ومفاہیم میں گہرا طنز چھپا ہوا ہے یقیناً سگریٹ نوشی انسان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہے۔

"انشائیہ اصلاً ایک ساختیہ ہے جو اپنے عناصر کی حاصل جمع سے کچھ

زیادہ ہوتا ہے۔"[۱۶]

محمد سلیم ملک کے اسلوب میں یہ خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔"ٹیلی فون"،"الیکشن"،"اخبار دیکھنا""داخل کرانا بچوں کا، سکول میں"، "اَوور ٹائم"،"چائے نوشی"،اور اسی نوع کے دیگر انشائیوں میں نہ صرف روزمرہ معلومات کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔

حیدر قریشی کی کتاب "فاصلے، قربتیں" میں شامل انشائیہ "خاموشی" اس چیز کا واضح عکس دکھائی دیتا ہے کہ ہنگامہ اور شور زندگی کے عکاس نہیں ہیں بلکہ حقیقی معنوں میں خاموشی کو اہمیت حاصل ہے۔حیدر قریشی خاموشی اور سناٹے میں فرق واضح کرتے ہوئے خاموشی کو دل کی دھڑکن سے مشروط کرتے ہیں۔دل ایک خاص وقفے میں خاموشی اختیار کرتا ہے اور پھر دھڑکتا ہے۔لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ خاموشی بھی اپنی زبان رکھتی ہے۔عبادت میں خاموشی اختیار کرنے کو نہایت ضروری قرار دیا گیا ہے۔صوفیائے کرام نے بھی ہمیشہ خاموشی اختیار کی جب کہ معاشرتی حوالے سے اس کا فقدان محسوس نظر آتا ہے۔خاموشی کے اندر بے پناہ معانی ومفاہیم پوشیدہ ہوتے ہیں جب کہ آواز اپنی مخصوص معنویت برقرار رکھتی ہے۔خاموشی کو توڑنے کے لیے آواز درکار ہوتی ہے تاہم اس سے پریشانی اور اضطراب جیسی کیفیت نمودار ہوتی ہے۔بین الاقوامی سطح پر بھی امن واتحاد کے نام پر قائم ہونے والے ادارے منتظر نظر آتے ہیں چنانچہ ان اداروں میں بھی اس نوعیت کی تقریبات ضروری ہیں جہاں خاموشی کا پرچار کیا جاسکے۔حیدر قریشی نوجوان نسل کو شور اور ہنگامہ خیز قرار دیتے ہیں۔نوجوان اپنے بزرگوں کا ادب واحترام کرنے کی بجائے برملا اظہار کو ترجیح دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ معاشرہ امن پسندی کی بجائے افراتفری میں مبتلا ہے۔جو لوگ شور شرابا پسند کرتے ہیں وہ ہر وقت کسی نہ کسی شرارت یا فساد میں مصروف رہتے ہیں جب کہ خاموشی امن کی علامت ہے چنانچہ اس کی وجہ سے ماحول کشیدہ نہیں ہوتا۔میاں بیوی کی زندگی میں لڑائی جھگڑا بھی شور کی پیداوار ہے وگرنہ گھر کی پرسکون رونق ہمیشہ خاموشی کی بدولت ممکن ہے۔اس انشائیے میں ڈھول کی تھاپ، ٹیلی ویژن کی پکار اور موسیقی کی یلغار کو شور قرار دیا گیا ہے۔گریر سن نامی شخص کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ اس نے ہندوستان کی زبانوں پر مسلسل کام کیا اور جب اس کی اپنی سالگرہ پر لوگ مبارک باد دینے گئے تو وہ اپنے ارد گرد کتابوں کا ڈھیر لیے خاموشی سے کام میں مصروف تھا۔اسے مبارک باد دی گئی تو وہ حیرت زدہ ہوا کہ اسّی برس گزر گئے اور اسے پتا ہی نہیں چلا۔اس انشائیے کو "دھماکہ خیز" قرار دیا گیا ہے۔

حیدر قریشی کا انشائیہ ''نقاب'' خواتین کے پردے سے متعلق حیرت انگیز مشاہدات پر مبنی ہے، صرف خواتین سے منسوب کیے جانا مناسب نہیں بلکہ آج کے دور میں ہر شخص ہی کسی نہ کسی نقاب کو اوڑھے رکھتا ہے۔ اس حوالے سے روزمرہ زندگی کے مختلف کرداروں سے واقفیت دلائی گئی جو بظاہر کچھ ہوتے ہیں لیکن حقیقت ان کے بارے میں خاصی مختلف واقع ہوتی ہے۔ حیدر قریشی انسانی چہروں کو بھی نقاب قرار دیتے ہیں کیوں کہ ان کے پس پردہ حیوان یا فرشتے موجود ہوتے ہیں۔

انشائیہ ''وِگ'' میں زلفوں کی گم شدگی کے بعد عارضی طور پر اس کمی کو پورا کرنے کی چیز کے بارے میں آگاہ کرتے ہیں۔ حیدر قریشی کے خیال میں وِگ کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اسے اُتارنے کے بعد اصلیت کا جائزہ لیا جاسکتا ہے جس طرح بہار کے آنے سے ہر سو رونق بڑھ جاتی ہے اور خزاں سارا حسن نوچ لیتی ہے اسی طرح انسانوں میں بھی بھیس بدل کر دوسروں کے سامنے اصلی روپ چھپانے کی عادت برقرار ہے۔ محمد وسیم انجم حیدر قریشی کے انشائیوں کو اس انداز سے دیکھتے ہیں:

> ''یہ ایسی نثری تحریر ہے جس میں انشائیہ نگار غیر رسمی اور شگفتہ انداز میں اپنا مافی الضمیر قاری تک پہنچاتا ہے۔''[۱۷]

حیدر قریشی کے انشایئے ''فاصلے، قربتیں'' میں دو متضاد کیفیتوں کو یک جا کیا گیا ہے۔ بظاہر خوب صورت اور دل کش نظر آنے والے پہاڑ دور سے اپنے حسن کا جلوہ بکھیرتے ہیں جب کہ ان کا سفر اختیار کیا جائے تو یہ انتہائی پُر خطر اور ہیبت ناک ہو جاتے ہیں۔ ہر ہیرو کے اندر بھی ایک وِلن چھپا ہوتا ہے جو ہمیں دوری کی وجہ سے دکھائی نہیں دیتا جب کہ عظیم لوگوں کے بارے میں بھی ان کے کم و بیش یہی تاثرات ہیں کہ ان لوگوں کے ساتھ رہنے والے اصلیت سے واقف ہوتے ہیں۔ یہی کیفیت انشائیہ ''یہ خیر و شر کے سلسلے'' میں بھی موجود ہے۔ اس طرح انشائیہ ''بڑھاپے کی حمایت میں'' انسانی زندگی کی آخری سطح سے واقفیت دلاتا ہے۔ جوانی کے خوبصورت ایام گزارنے کے بعد انسان بڑھاپے کے دن اس خوف سے گزارتا ہے کہ اب اس میں طاقت و ہمت نہیں جب کہ اس آخری عمر کے حصے کو بھی اپنی تمام تر رعنائیوں سمیت قبول کرنا چاہیے۔

> ''انشائیہ ایک صنفِ ادب کے طور پر کسی مقصد کا آلہ کار نہیں بنایا جاسکا۔''[۱۸]

دنیا میں کئی ایسے مذاہب بھی ہیں جہاں خیر اور شر پر مبنی دو خداؤں کا تصور موجود ہے۔ حیدر قریشی کے خیال میں یہ آمیزش ہی کائنات کی رنگینی کا باعث ہے ورنہ محض خیر سے سارا نظام منجمد ہو جاتا ہے۔

> ''تمام چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں۔ سردی اور گرمی، بہار اور خزاں، دن اور رات، علم ریاضی کا سارا نظام جمع اور نفی پر قائم ہے۔ بجلی میں مثبت اور منفی مل کر کرنٹ پیدا کرتے ہیں۔ تمام جان داروں میں نر اور مادہ مل کر زندگی کو قائم رکھتے ہیں۔''[۱۹]

حیدر قریشی انشائیے ''اطاعت گزاری''، ''اپنا اپنا سچ''، ''تجربہ اور تجربہ کاری'' اور ''چشم تصور'' میں سادہ اور عام فہم انداز میں زندگی کی حقیقتوں سے پردہ اُٹھاتے ہیں۔ انھیں متضاد کیفیتوں کو اجاگر کرنے میں مہارت حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ وہ قاری کو اپنے موضوعات کی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب رہتے ہیں تاہم بعض اوقات دو متضاد کیفیتوں کی عکاسی کرتے ہوئے وہ اپنا جھکاؤ ایک جانب منتقل کر لیتے ہیں جس کی وجہ سے دوسرے رُخ کی وضاحت میں تشنگی محسوس ہوتی ہے۔

خطۂ بہاول پور کے ایک اور نامور ادیب اظہر ادیب کا انشائیہ ''گول کیپر'' کالج کے اُن دنوں کی یاد داشت پر مشتمل ہے جب پہلی بار اپنے دوستوں کے ہمراہ سالانہ کھیل میں شرکت کرتے ہیں۔ کھیل کی مکمل صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے بعد روزمرہ زندگی میں اس کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بال کے حصول کے لیے چھینا جھپٹی کا منظر اکثر گھروں میں کھانے کی میز پر بھی دکھائی دیتا ہے جب بچے آپس میں لڑ پڑتے ہیں۔ اظہر ادیب گول کیپر کی خصوصیات کو سپہ سالار کے ہم پلہ قرار دیتے ہیں۔

> ''پوری ٹیم میں صرف وہی ہوتا ہے جس کے بدن کی حفاظت کے لیے بہت کچھ جتن کیے جاتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سب سے قیمتی وجود گول کیپر کا ہوتا ہے۔۔۔ اس گیند کو جسے ٹیم کے باقی دس کھلاڑی نہیں روک سکتے۔ گول کیپر اپنی مہارت سے اکثر روک لیتا ہے اور انتہائی حقارت سے مخالف ٹیم کے منہ پر مارتا ہے۔''[۲۰]

انشائیے میں عام زندگی میں ملنے والے مختلف گول کیپروں سے آگاہ کیا گیا ہے جو دوسروں کے مسائل کہیں اور موڑ دیتے ہیں اور بارہا کوشش کے باوجود مسائل کا فوری حل نہیں نکالتے بلکہ گول کیپر کی طرح ٹھوکر لگا کر پوری قوت سے واپس بھیج دیتے ہیں۔

اظہر ادیب کا انشائیہ ''گھڑا'' ماضی کی اہم ضرورت کے بارے میں ہے۔ وہ ایامِ جوانی میں سائیکل کی آمدورفت اور اس موقع پر پیاس کی شدت محسوس کرتے ہوئے گھڑے کے پانی کو غنیمت قرار دیتے ہیں۔ لوگ مسافروں کے لیے راستے میں پانی کا انتظام کرتے تھے جب کہ موجودہ دور میں ''کولر'' اور ''فریج'' نے گھڑے کی حکمرانی چھین لی ہے۔

> ''گھڑے کا اپنا ایک کنبہ ہے۔ صراحی اس کی چھوٹی بہن ہے جو گلے میں موتیا اور چنبیلی کے ہار پہن کر کسی نازنین کی طرح شرماتی لجاتی رہتی ہے اور جب اسے ہاتھ لگائیں تو اس کے نازک ہونٹوں سے معصوم قہقہے چھلکنے لگتے ہیں۔ چاٹی شاید ماں ہے جس نے اسے اور صراحی کو جنم دیا۔''[۲۱]

فن کار کا لاشعور بھی گھڑے کی مانند ہے کیوں کہ وہ تخلیق کے ذریعے دوسروں کو آسودہ کرتا ہے۔ انشائیے میں موجودہ دور کی مصنوعات اور مصنوعی رہن سہن پر طنز شامل ہے۔ انسان کے لیے آسودگی کا باعث قدرتی مناظر اور فطری زندگی ہے لہٰذا مصنوعی بناوٹ کبھی بھی دلی سکون فراہم نہیں کرتی۔ اظہر ادیب کا انشائیہ "سگریٹ" مضر صحت چیز کی منفرد خصوصیات کو اجاگر کرتا ہے۔ وہ سگریٹ کے دھوئیں کو پرواز سے تشبیہہ دیتے ہیں ۔ڈاکٹر اس کو صحت کے لیے نقصان دہ قرار دیتے ہیں جب کہ اس کے استعمال سے انسان کئی معاملات میں خود کفیل ہو جاتا ہے۔

اظہر ادیب کے دیگر انشائیوں میں "سوچنا" میں انسانی سوچ کو ایک مرض قرار دیتے ہیں۔ سوچ کی تبدیلی کے باعث بڑے بڑے بادشاہ اپنا تخت چھوڑ کر جھونپڑیوں کے مکین ہوئے اس حوالے سے "گوتم بدھ" کی مثال دی گئی ہے جو اس بیماری میں مبتلا ہو کر عیش و عشرت سے اپنا دامن چھڑا بیٹھا۔ پرانے دور میں لوگ جانوروں پر سفر کرتے لیکن کسی حادثے کے بارے میں اطلاع نہیں ملتی تھی۔ اگر کوئی حادثہ ہو بھی جاتا تو محض ہڈی ٹوٹنے تک محدود رہتا تاہم انسانی سوچ نے نت نئی ایجادات کو فروغ دیا اور آج کے دور میں انسانی زندگی غیر محفوظ ہو گئی ہے۔ اسی طرح انشائیہ "کرسی" تخت نشینی کے مختلف ادوار کو اُجاگر کرتا ہے۔ ماضی میں انسان جنگلوں کا باسی تھا اور ایک دوسرے کے ساتھ کسی قسم کے مقابلے کی فضا موجود نہیں تھی تاہم اس وقت کوئی طاقت ور اور ذہین شخص یہ سوچ سامنے لے کر آتا ہے کہ اسے کسی بلند جگہ پر حکمرانی کرنی چاہیے۔ چٹان پر بیٹھنے والے انسان کے پاؤں زمین پر تھے یا پھر اس کا زمینی رابطہ برقرار رہتا تھا تاہم کرسی پر بیٹھنے والا ان چیزوں سے مبرا ہوتا ہے۔ انشائیہ "خوشامد" انسان کی جبلی فطرت کو اُجاگر کرتا ہے۔ یہ ایسا کارآمد ہتھیار ہے جو دوسروں کے "وحشی پن" کو عارضی طور پر گہری نیند سلا دیتا ہے۔ اظہر ادیب اس بات کے متقاضی ہیں کہ خوشامد کے لیے باقاعدہ تعلیم و تربیت کا بندوبست ہونا چاہیے تاکہ اس کی بدولت شک و شبہات اور غیر یقینی صورتِ حال سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکے۔ اظہر ادیب سادہ اور پُر تاثیر انداز میں اپنا مؤقف واضح طور پر بیان کرتے ہیں۔

منور عثمانی بہاول پور کے نوجوان انشائیہ نگار ہیں۔ ان کا انشائیوں پر مبنی مجموعہ "فرنٹ سیٹ" کے عنوان سے شائع ہوا۔ گاڑی کی فرنٹ سیٹ پچھلی نشستوں کی نسبت آرام دہ اور موزوں قرار دی جا سکتی ہے۔ یہ سیٹ کشادگی کے ساتھ فطرت کی دل کشی اور رعنائیوں سے متعارف کراتی ہے۔ اس انشائیے میں "فرنٹ سیٹ" پر بیٹھنے والے شخص کی رائے کو معتبر تصور کیا گیا ہے کیوں کہ وہ قدرتی مناظر کو جزئیات کے ساتھ بیان کرتے ہوئے اپنی بات کو دلائل سے منوا سکتا ہے جب کہ پچھلی نشستوں پر مامور افراد اس خاصیت سے محروم ہوتے ہیں۔ اگر پچھلی سیٹوں پر بیٹھنے والے افراد سیاسی مباحثوں میں مشغول ہوں یا مختلف نظریات کے حامل افراد آپس میں گتھم گتھا ہو جائیں تو اگلی نشست پر بیٹھا ہوا شخص ان مسائل سے الگ تھلگ دکھائی دیتا ہے۔

> "جب "کن فیکون" کا اوّلین سفر جاری تھا، حضرت انسان فرنٹ سیٹ پر بیٹھا اس سارے تخلیقی عمل کا بغور مطالعہ کر رہا تھا اور کارِ جہاں سے نمٹنے کے لیے کئی باریکیوں سے واقف ہو رہا تھا۔"[۲۲]

انسان کو جب دنیا میں تخلیق کاری کا موقع ملا تو اس نے یہاں بھی ایک گاڑی میں بیٹھے ہوئے ماضی کو ونڈ سکرین بنا کر ان مناظر سے کبھی لطف لیا اور کبھی افسردہ ہوا چنانچہ "فرنٹ سیٹ" کی قدر و قیمت کا تعین کیا جائے تو یہ دوسری نشستوں کے برعکس بے پناہ معانی و مفاہیم کی حامل ہے۔ منور عثمانی نے پہلا انشائیہ "فرنٹ سیٹ" اتنے بھرپور انشائی اسلوب میں سپردِ قلم کیا کہ مشاہدے اور تخیل کی باریک بینی کے طفیل انشائیہ قاری کو ساتھ بہا لے جاتا ہے۔

انشائیہ "ممتحن کی ڈائری" طنز و مزاح کے خفیف تاثر پر مبنی ہے جب کہ انشائیہ "متفرق پرچیوں پر لکھا میں" میں منور عثمانی پرچی کی کیفیت انسانوں میں بھی تلاش کرتے ہیں۔ بعض لوگ "مسودہ آدمی" قرار دیے جاسکتے ہیں اور بعض کا شمار "پرچی پرچی شخص" کے طور پر ہوتا ہے۔ مسودہ آدمی کسی بھی نظام کی بنیاد قرار دیا جاسکتا ہے جب کہ پرچی پرچی شخص اپنی بکھری ہوئی بے ترتیب زندگی میں ہونے اور نہ ہونے کی کش مکش میں مبتلا رہتا ہے۔ یہی کیفیت کائنات کے نظام پر بھی سوال اُٹھاتی ہے کہ اس کا نظام ایک مربوط مسودے کی مانند ہے یا پرچیوں کی مانند بکھرا ہوا، پرچیوں کے مفہوم کو شانِ نزول کی بجائے شانِ قرأت سے دیکھنا زیادہ بہتر ہے۔ منور عثمانی "کمزور لمحہ" کے عنوان سے لکھے گئے انشائیے میں ایسے لمحات کو نئے معانی و مفاہیم کا آغاز سمجھتے ہیں جنھیں بالعموم کم زور لمحہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ لمحے واقعے کے وقوع پذیر ہونے کی علامت قرار دیے جاتے ہیں جب کہ کمزور لمحوں میں غلطیاں اپنے تخلیقی اظہار کا باعث بنتی ہیں اور ان کی "زرخیزی" بھی خوش آئند نظر آتی ہے۔ نقادانِ فن نے انشائیے کے جس قدر خدو خال واضح کیے ان کے تناظر میں منور عثمانی کئی انشائیہ نگاروں کو پیچھے چھوڑ گیا۔

منور عثمانی کا انشائیہ "میرا شہر" بہاول پور کی تاریخی اہمیت، خوب صورتی اور تہذیب و ثقافت سے روشناس کرایا گیا ہے۔ یہاں ریگستان نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں لیکن قرب و جوار کے قصبوں اور شہر کی رونق نے اسے منفرد بنا دیا ہے۔ معصومیت اور شرم و حیا میں لپٹا یہ شہر جدت کو اپناتا ہے تو اس میں بھی اپنی الگ شناخت برقرار رکھتا ہے۔

> "یہاں کسی ناصر کا دل اُداس نہیں ہوتا کیوں کہ یہ شہر "سائیں سائیں" کرنے کی بجائے "سئیں سئیں" کرتا ہے۔۔۔"[۲۳]

ہر شخص اپنے علاقے سے محبت کرتا ہے اور یہ ایک فطری عمل ہے لیکن اس حوالے سے والہانہ پن کم لوگوں میں دکھائی دیتا ہے۔ منور عثمانی اس شہر کی جدائی کے بعد جذباتی انداز میں اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں۔

> "فرنٹ سیٹ" کے تمام انشائیے جملہ انشائی اوصاف سے مملو ہیں۔"[۲۴]

"ایک کردار اپنے خالق سے" کے عنوان سے منور عثمانی کا انشائیہ ان کہانیوں کے گرد گھومتا ہے جن میں انسان کے مختلف روپ ظاہر ہوئے اور انھیں تاریخی حیثیت دے دی گئی۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول "ابن الوقت" کے بارے میں وہ نوحہ کناں ہیں کہ انسان ایک ایسے کردار میں ڈھل گیا

کہ جو تخیل کی بدولت ہمیشہ ایک خاص نام سے پکارا جائے گا۔ یہ کردار وقت کے تھپیڑوں میں گرتا اور سنبھلتا رہا لیکن اس کے خالق نے کبھی نہ سوچا کہ کہانیوں کے اندر بھی بے شمار کہانیاں چھپی ہوتی ہیں۔ ایک ہی لاٹھی سے ہانک دینے میں کئی کردار اپنی حیثیت کھو دیتے ہیں۔ جدید داستان کے پہلے کردار کی حیثیت سے "ابن الوقت" اپنے دکھوں کی داستان بیان کرتا ہے۔ اسے افسوس ہے کہ زندگی کی مصیبتوں سے نبرد آزما ہونے کے باوجود اس کے خالق نے وفا نہ کی۔ یہ کردار اپنے خالق سے شکوہ کرتا ہے کہ اس نے "حجت الاسلام" کو ماضی، حال اور مستقبل کا امین قرار دیا جب کہ ابن الوقت کو بے یارو مددگار چھوڑ دیا گیا۔ اس کردار کے خالق نے سے مسائل کا انبار اکٹھا کر دیا جب کہ حجت الاسلام کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے خود کھڑے ہو گئے۔ ابن الوقت ڈپٹی نذیر احمد سے کہتا ہے:

"آپ شروع ہی سے میرے لیے منفی جذبات رکھتے تھے، میں تو فقط یہ چاہتا تھا
کہ مجھے "خلق" نہ کیا جائے، "خلق ہونے" دیا جائے۔"[۲۵]

"ابن الوقت" اپنے خالق سے مقابلہ بازی کی فضا قائم کرتا ہے۔ وہ ہر اس حوالے کا تذکرہ کرتا ہے جس میں اس کی حق تلفی کی گئی اور خالق نے کسی قسم کا تعاون نہیں کیا بلکہ اس کوشش میں کہانی کو آگے بڑھایا کہ "ابن الوقت" کو ذلیل و رسوا کیا جا سکے۔ اس کے مقابلے میں وہ "حجت الاسلام" کے لیے سیسہ پلائی دیوار بن گئے اور اسے ہر حال میں منوا کر دم لیا۔ یہ کردار اپنی خستہ حالی اور بدنامی کا موجب تخلیق کار کو دیتا ہے جس نے آغاز میں ہی عہد کر لیا تھا کہ اس کردار کو ذلیل و رسوا کر کے چھوڑوں گا۔ منور عثمانی کے دیگر انشائیوں "طنز"، "سرمایہ کاری"، "حرف سپاس"، "بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں"، "ایک قابلِ واپسی خط"، "باتیں کیا کرو"، "کہانی" اور دیگر انشائیے جہاں ان کی انشائیہ نگاری ایسی صنف پر مضبوط گرفت کا واضح ثبوت ہیں وہیں اس صنف ادب کے روشن مستقبل کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے۔

ان انشائیوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بظاہر کم عمر رکھنے والی یہ ادبی صنف نہ صرف اپنے بھرپور قد و قامت کے ساتھ جلوہ بکھیر رہی ہے بلکہ اس نے اردو ادب میں بھی خود کو جاندار حیثیت سے منوایا ہے، درج بالا چند انشائی نمونوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ادبی و تاریخی اہمیت کا حامل خطہ کس طرح اپنے وسیع تر دامن میں انشائیوں نگاروں کو پناہ دیئے ہوئے ہیں۔ جس طرح اردو ادب میں یہ صنف اپنے الگ تشخص کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے خود کو منوا رہی ہے، اس سے اس صنف کا اعتبار بحال ہوا ہے۔ اچھی اور عمدہ شروعات اپنے اندر گیری فکر اور عمیق مشاہدے کو لیے ہوئے ہے اور یہی چیز انشائیہ نگاری کی کامیابی قرار دی جا سکتی ہے۔ بلاشبہ خطۂ بہاول پور میں بھی اس صنف کے حوالے سے کئی خوب صورت انشائیے منظر عام پر آئے۔ اس حوالے سے جن دیگر انشائیہ نگاروں کو اہمیت حاصل ہے ان میں، سید مشہود حسن رضوی، علی معین، سلیم الرشید، سیّد زوار حسین شاہ اور خالد نذیر کا نام انفرادیت کا حامل ہے۔

حوالہ جات

۱۔ علی محمد خان، ڈاکٹر/اشفاق احمد ورک،ڈاکٹر،''اصنافِ نظم و نثر''، الفیصل ناشران و تاجران کتب ، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور، نومبر ۲۰۱۶ء،ص:۳۰۵

۲۔وحید قریشی،ڈاکٹر،''اُردو کا بہترین انشائی ادب''،مکتبہ فکر وادب،س۔ن،ص:۱۲

۳۔ فرمان فتح پوری،ڈاکٹر،''اُردو نثر کا فنی ارتقاء''،الوقار پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۹۷ء،ص:۲۱۸

۴۔شاہد حسن رضوی،ڈاکٹر،سہ ماہی''الزبیر''(اصنافِ ادب نمبر)،اُردو اکیڈمی،بہاول پور،ص:۱۳۹

۵۔ شفیق احمد، ڈاکٹر/روشن آرا راؤ، ڈاکٹر، (مرتبین)''انتخاب انشائیہ نمبر''، شعبۂ اُردو واقبالیات، اسلامیہ یونیورسٹی ، بہاول پور، بار اوّل،۱۹۸۸ء،ص:۸۰

۶۔ منور عثمانی،''فکر واسلوب کا نیا موسم''،مشمولہ ماہ نامہ''تخلیق''،لاہور،جون ۲۰۱۵ء،ص:۴۳

۷۔ سلیم اختر،ڈاکٹر،''انشائیہ کی بنیاد''،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۸۶ء،ص:۱۱۴

۸۔ محمد افتخار شفیع،''اصنافِ نثر''،بیت الحکمت،لاہور،۲۰۱۲ء،ص:۱۱۱

۹۔انجم نیازی،''فل سٹاپ''،''مشمولہ''،''نئے انشائیے''،مرتب:سلیم آغا قزلباش،مکتبہ فکر وخیال،لاہور،۱۹۹۱ء،ص:۹۱۔۹۲

۱۰۔ماہ نامہ''کاغذی پیرہن''،شمارہ نمبر ۳۰،نومبر/دسمبر ۲۰۱۴ء،ص:۲۲

۱۱۔میر ظفر زیدی، حکیم، سیّد،''نوک سناں سے چٹکتی کلیاں''،مکتبہ آزاد،ماڈل ٹاؤن(بی)،بہاول پور،بار اوّل،۲۰۰۷ء، ص:۱۰۷۔۱۰۸

۱۲۔روشن آرا راؤ،ڈاکٹر،''نگار شاتِ روشن''،دنیائے اُردو پبلی کیشنز،اسلام آباد،فروری ۲۰۱۶ء،ص:۵۵۔۵۶

۱۳۔ محمد سلیم ملک،ڈاکٹر،''باتیں ہماری یاد رہیں''،بک ہوم،۴۶۔مزنگ روڈ،لاہور،ستمبر ۲۰۰۳ء،ص:۳۵

۱۴۔ شفیع ہمدم،''انشائیہ اور انفرادی سوچ''،مشمولہ سہ ماہی''الزبیر''،شمارہ نمبر:۱،بہاول پور،۲۰۱۴ء،ص:۲۹۸

۱۵۔ سلیم آغا قزلباش،(دیباچہ)''نام میں کیا رکھا ہے''،کاغذی پیرہن ۲۷۔بیڈن روڈ،لاہور،اشاعت اوّل،جنوری ۲۰۰۵ء

۱۶۔ سنبل نگار،ڈاکٹر،''اُردو نثر کا تنقیدی مطالعہ''،کتاب سرائے،لاہور،۲۰۰۳ء،ص:۲۶۴

۱۷۔ محمد وسیم انجم،''حیدر قریشی فکر وفن''،انجم پبلی کیشنز،راول پنڈی،۱۹۹۹ء،ص:۸۵

۱۸۔اکبر حمیدی،''جدید اُردو انشائیہ''،اکادمی ادبیات پاکستان،اسلام آباد،ستمبر ۱۹۹۹ء،ص:۳۰

۱۹۔حیدر قریشی،"عمر لاحاصل کا حاصل"،معیار پبلی کیشنز،دہلی،۲۰۰۵ء،ص:۲۲۸

۲۰۔ سہ ماہی "اوراق" (انشائیہ نمبر)، مدیران: وزیر آغا/سجاد نقوی(اعزازی)، جلد نمبر :۲۳، شمارہ نمبر:۶۔۷، دفتر اوراق چوک اُردو بازار ،لاہور،جون/جولائی۱۹۸۸ء،ص:۶۷

۲۱۔پندرہ روزہ"حقیقت"،بہاول پور،یکم تا۱۵/اپریل۲۱۰۸ء،ص:۶۶

۲۲۔منور عثمانی،"فرنٹ سیٹ"،سانجھ پبلی کیشنز سیکنڈ فلور مفتی بلڈنگ ۳۱/۱۷ ٹمپل روڈ،لاہور،۲۰۱۰ء،ص:۱۸

۲۳۔پندرہ روزہ"حقیقت"،بہاول پور،یکم تا۱۵/اپریل۲۱۰۸ء،ص:۶۶

۲۴۔ سہ ماہی "اوراق" (انشائیہ نمبر)، مدیران: وزیر آغا/سجاد نقوی(اعزازی)، جلد نمبر :۲۰، شمارہ نمبر:۴۔۵، دفتر اوراق چوک اُردو بازار ،لاہور،اپریل/مئی۱۹۸۵ء،ص:۱۰۰

۲۵۔ماہنامہ"کاغذی پیرہن"،شمارہ نمبر:۳۰،نومبر/دسمبر۲۰۱۴ء،ص:۱۹